پیش گفتار

بیگم انیس قدوائی کی پہلی کتاب ۱۹۷۴ء میں، دوسری ۱۹۷۶ء میں اور تیسری ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ میرے خیال میں ان کی کتابوں کی اشاعت کے یہ سنہ ان کے ادبی سفر کی خبر نہیں دیتے۔ دراصل انھوں نے لکھنے لکھانے کا کام اس صدی کی دوسری دہائی سے شروع کیا تھا۔ اس طرح اُن کی ادبی عمر اُن کی شہرت کے تناسب سے کہیں زیادہ طویل ہے۔ ان کا پہلا مضمون جو میری نظروں سے گزرا ہے، وہ 'عصمت' دہلی میں ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا اور اس زمانے میں ادبِ لطیف یا رومانی انداز کی نثر کا جو چلن تھا، اس سے ہم آہنگ تھا۔ اس دَور کے خواتین کے رسالوں میں ان کے بہت سے مضامین دفن پڑے ہیں۔ ان مضامین میں وہ مضامین بھی شامل ہیں جو ان کے بنیادی رنگ میں ہیں، یعنی طنزیہ اور مزاحیہ ہیں۔ درحقیقت یہ دور سرسید تحریک کے زیرِ اثر پروان چڑھ رہا تھا اور مسلم خواتین بھی اپنی تعلیم اور اصلاح کے لیے فکرمند اور کوشاں تھیں۔ انھیں اپنی معاشرتی زبوں حالی کا شدید احساس تھا۔ وہ ان بندشوں سے بیزار تھیں جو انھیں جکڑے ہوئے تھے۔ اس ناآسودگی نے ابھی بغاوت کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا۔ ان کے دلوں میں صرف اصلاحِ معاشرت کی خواہشیں انگڑائیاں

لے رہی تھیں۔ چنانچہ اس دور کی خواتین کی تحریروں میں رقت آمیزی کا رجحان نظر آتا ہے جسے غالباً مصورِ غم راشد الخیری کی تحریروں نے اور بھی شدید کر دیا تھا۔ آنسوؤں میں بھیگی ہوئی اس اصلاح پسندی کے پس منظر میں بیگم انیس قدوائی کی اوّلین تحریروں کو دیکھیے تو ان کی ذہنی جرأت میں انحراف کا ایک خوش گوار اور تازہ کار عنصر نظر آئے گا۔ انھوں نے طنز و ظرافت کی راہ اختیار کی تھی۔ یہ راہ اسی وجہ سے اہم ہے کہ اس میں محض مسلمان عورت کی زبوں حالی سے ناآسودگی نہیں ہے بلکہ اس میں تعمیری قسم کی بغاوت کی چنگاریاں بھی چمکتی نظر آتی ہیں۔

خوش طبعی اور ظرافت کا یہ رجحان انھیں اپنے والد ولایت علی بمبوق سے ورثے میں ملا تھا جو 'کامریڈ' اور 'نیو ایرا' کے کالموں میں اپنی ظرافت اور بشاشت کا سکہ جما چکے تھے۔ وہ اس وقت کے ادبی منظر نامے پر کچھ اس طرح چھائے ہوئے تھے کہ ان کے ارادت مندوں کو ان میں چسٹرٹن اور برنارڈ شا کی روح کارفرما نظر آتی تھی۔ افسوس کہ یہ 'شعلۂ مستعجل' اپنی خوش درخشیدگی دکھا کر صرف ۳۳ سال کی عمر میں سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ مگر یہ شعلہ اپنی تابانی اور تابناکی بڑی خاموشی سے اپنی بیٹی کے ذہن و احساس میں منتقل کر چکا تھا۔

بیگم انیس قدوائی کے ابتدائی مضامین میں شائستہ طنز و ظرافت کا جو معیار ہے اس کا ابھی تک اعتراف نہیں کیا گیا ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ عام طور پر عورت کو حسِ ظرافت سے عاری سمجھا جاتا ہے، مرد اسے صرف جذبات کی پوٹ سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ صدیوں کے جبر نے بھی اسے سنجیدہ اور منہ بسورنے والی ہستی میں تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ ظرافت اور خوش طبعی کی روشنی سے محروم۔ کہیں کہیں عورتوں کی تحریروں میں ظرافت اور طنز کی جھلکیاں نظر آ بھی جاتی ہیں تو ان میں نہ وسعت ہوتی ہے اور نہ ہی گہرائی۔ ان کی ظرافت گھر اور گھر کے افراد سے آگے نہیں نکل پاتی، اس کے حدودِ اخذ (Catchment Areas) محدود ہوتے ہیں۔ بیگم انیس قدوائی کے یہاں خواہ موضوعات گھریلو قسم کے

ہوں مگر ان کا تخلیقی تخیل بظاہر مختلف اشیا کے درمیان دل چسپ اور حیرت انگیز مماثلتیں تلاش کر لیتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے موضوع میں اسیر نہیں رہتیں، بیکراں ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ترقی پسند سیاسی اور تہذیبی شعور ان کے طنز میں باخبری اور آگہی کا قابلِ توجہ عنصر شامل کر دیتا ہے۔ یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ دنیا کے بڑے طنز نگار عام طور پر قدامت پسند ہوتے ہیں اور وہ اپنے طنز کی مدد سے ایک بکھرتے ہوئے تہذیبی نظام کی بقا اور استحکام کے لیے تہذیب کے نئے عناصر کو ہدف بناتے رہے ہیں۔ شاعری میں اکبر الہ آبادی اور نثر میں رشید احمد صدیقی کے تہذیبی رویے روایت پرستانہ ہیں۔ انقلابی تبدیلیوں کی خاطر طنز و ظرافت کا استعمال کم ہوا ہے اور بہت ہی کم۔

بیگم انیس قدوائی نے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا تھا جو علی گڑھ تحریک کی عقلیت سے متاثر تھا اور اپنے گرد و پیش کی دنیا کو عقل کی روشنی میں پرکھنے کی جرأت کر رہا تھا، وہ ایک ایسی مشرقیت کا قائل تھا جس میں مغربی تہذیب کے بھی صالح اور صحت مند عناصر شامل ہوں۔ اس گھرانے میں مذہبیت تھی مگر وسیع المشرب مذہبیت، اس میں سیاست تھی مگر سامراج دشمن اور ترقی پسند سیاست۔ یہ گھرانا اودھ کے ان پہلے مسلم گھرانوں میں سے تھا جس نے کانگریس کی سیاست کو اختیار کیا اور پورے خلوص کے ساتھ اختیار کیا اور اپنے روایتی اسلوبِ زندگی کو بدل ڈالا۔ یہ وہ ماحول تھا جس میں انیس قدوائی کی شخصیت نکھری اور پروان چڑھی۔ اگرچہ ان کی تعلیم صرف گھر پر ہی ہوئی تھی پھر بھی ان کی آگہی کا افق برابر وسیع ہوتا رہا۔ وہ انگریزی ادبیات سے براہِ راست استفادہ تو نہیں کر سکیں پھر بھی تراجم کے ذریعے اس تک ان کی رسائی تھی۔ فارسی اور اردو ادبیات کو انھوں نے ایک انتہائی چوکس تنقیدی شعور کے ساتھ پڑھا اور سمجھا تھا۔

ماحول، تعلیم اور تربیت کی وجہ سے بیگم انیس قدوائی کی ظرافت روشن بصر، ترقی پسند اور تابندہ ضمیر ہے۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں طنز و ظرافت کو بنیادی اہمیت

حاصل ہے ۔ بعد کی تحریروں میں طنز کا رنگ ہلکا اور خوش طبعی اور مزاح کا رنگ گہرا اور نمایاں ہوتا چلا گیا ۔ اس کتاب میں میں نے چند ایسے ابتدائی مضامین کا ایک انتخاب پیش کیا ہے جو پُرانے رسائل میں دفن تھے اور جنھیں شاید وہ خود بھی بھول چکی تھیں ۔ اس انتخاب کا مقصد جہاں ایک طرف ان کی ابتدائی نگارشات کو منظرِ عام پر لانا ہے وہیں دوسری طرف یہ بھی ہے کہ آپ کو ان کی تخلیقی زندگی اور اسلوب کے ارتقا کا بھی اندازہ ہوجائے ۔

اب ذرا ان کی ظرافت اور طنز کے کچھ ابتدائی نمونے دیکھیے اور ان کی اس معاملے میں جس ندرت اور انفرادیت کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ، اس کا اندازہ کیجیے :

"مجھے اقرار ہے کہ وہ (جاہل ساس) بہترین جج ہوتی ہے اور ایک اچھی انسپکٹر پولیس ۔ موقعِ واردات کی دیکھ بھال اور سربستہ رازوں کے انکشاف میں وہ محکمۂ سراغ رسانی کو شکست دے سکتی ہے ۔ دنیا کا بہتر سے بہتر سراغ رساں ایسے عقدہ ہائے پیچیدہ حل نہیں کر سکتا جیسے کہ ایک خود سر جاہل ہندستانی عورت اس تختِ ہیمونیت پر بیٹھ کر کرتی ہے ۔ اُسے مصلح ہونے کا دعوا ہوتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہترین مدبر ہوتی ہے ۔ مدبرین میں وہ اپنے وقت کی مسولینی یا مصطفےٰ کمال ، تحقیق و تفتیش میں جگدیش چندر بوس ، انتظام و خوش سلیقگی میں غازی امان اللہ اور جنرل ڈائر ہوتی ہے ۔"

(جاہل ساس)

"صلاحیت کے ساتھ کوئی مضمون لکھنا میرے لیے اتنا

ہی دشوار ہے جتنا لیڈرانِ ملک کے لیے آپس میں مختلف الرائے ہونا ۔"

(شوہر کا انتخاب)

"گردن کے لیے صراحی دار کا لفظ استعمال کرنا اسی قدر خلافِ واقعہ ہے جس طرح ہندستان کے تمام شور و شر اور جنگِ آزادی کو چند مخبوط الحواس سڑیوں کی افترا پردازی کہنا یا سارداِ بل کی مخالفت کرتے ہوئے مسلمانوں کے یہاں کم سنی کی شادی کے رواج کا اعلان کرنا ۔ بہرحال اگر گردن صراحی دار نہیں ہے تو عمارتوں کا شہتیر بھی نہیں ہے نہ ڈپٹی صاحب کی گاڑی کا بم ہے ، بس یہ سمجھ لیجیے وہ نہرو رپورٹ کا پلندہ یا 'ہمدرد' کا پُرانا فائل یا جج صاحب کی میز کا گلدان ...... عبدل کے لیے یہ اسی طرح بے حقیقت ہے جس طرح علمائے اسلام کے لیے جبہ و دستار یا گورنمنٹ کے لیے انقلابیوں کے بم یا مسلمانوں کے لیے زنانہ مدارس ۔"

('عبدل')

یہ چند اقتباسات ان کی ظرافت کی وسعت اور گیرائی کی طرف ادب کے سنجیدہ قاری کو ضرور متوجہ کریں گے ۔ ان میں بعض اشارے ہنگامی اور وقتی نوعیت کے ضرور ہیں پھر بھی ان سے اُن کے طنز کے تیکھے پن اور شمولیت یعنی Inclusiveness کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ان مضامین کی مدد سے ہمیں اس دور کے بعض اہم معاملات و مباحث کا بھی اندازہ ہوتا ہے ۔ آخری اقتباس میں اس خاکہ نگاری کی پیش آمد ملتی ہے جو کچھ بعد میں ان کے مجموعے "اب جن کے دیکھنے کو..." کے خاکوں میں نمایاں ہوئی ہے ۔ انشائیوں میں "نظرے خوش گزرے" کے ناتمام نقوش نظر آتے

ہیں۔ ناتمام اس وجہ سے کہ دورِ اوّل کے انشائیوں میں تخیئل کے وفور، اظہار کے تازہ کار استعاراتی عمل اور طنز و مزاح کی وسعت آفریں کارفرمائی کے باوجود پختگی اور حُسنِ تعمیر کی کمی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ بقول والٹر پیٹر (Walter Pater) ایک اچھی نظم کی طرح ایک اچھے نثر پارے میں بھی ایک اچھے انشاء پرداز کو حُسنِ تعمیر (Architectonics) کا خیال رکھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب میں شامل انشائیے انیس آپا کی تخلیقی زندگی کے تشکیلی دور سے متعلق ہیں۔ ایسے دور میں خام کاری اگر نہ ہو تو حیرت کرنی چاہیے۔ ان کے انشائیوں میں انشائیے اور افسانے کی آمیزش بھی فن پر مکمل دسترس نہ ہونے کی خبر دیتی ہے۔ اس دور میں انھوں نے ایک ڈراما بھی لکھا تھا جس کا نام تھا "جہالت کی شکست" اور جو اگست ۱۹۳۱ء میں 'عصمت' دہلی کے سالگرہ نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اس ڈرامے میں اساطیری رنگ کے ایسے کردار ہیں جو تمثیلی اظہار کی سطح سے بلند نہیں ہو پاتے۔ ۱۹۳۲ء میں انھوں نے ایک مختصر افسانہ بھی لکھا تھا جس کا نام تھا "پیر جی ناراض ہو گئے"۔ نقلی پیروں کے ہاتھوں معصوم عوام کے استحصال کے موضوع پر مبنی یہ افسانہ دراصل ایک مکالمہ ہے جو ایک ذہین مسلمان عورت اور ایک پیر صاحب کے مابین ہوتا ہے۔ اس میں افسانویت تو کم ہے مگر مکالموں میں تیزی اور تندی کے علاوہ بلا کی دھار بھی ہے۔ ان دونوں تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے افسانہ نگاری اور ڈراما نویسی کو اگر باقاعدگی سے اپنایا ہوتا تو ان میدانوں میں بھی اپنی انفرادیت کے نقش ضرور چھوڑ جاتیں۔ نثری اظہار کی مختلف ہیئتوں میں طبع آزمائی ان کے ذہن کی ناصبور تخلیقی توانائی کا پتا دیتی ہے۔ ان کی ابتدائی تحریروں میں تکمیل کی کمی کی تلافی ان کے اسلوب کی شائستگی اور شگفتگی سے ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہماری ادبی تاریخ کے جس مرحلے پر یہ تحریریں وجود میں آئی تھیں، اس میں ہمارے نثری اظہار کی مختلف شکلوں کی معیار بندی خود ابتدائی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ ایسی صورت میں نقد و نظر کے آج کے معیاروں کے مطابق

انھیں پرکھنا کسی طرح بھی مناسب نہ ہوگا۔ انھیں صرف ایک بیدار ذہن اور شگفتہ مزاج فن کار کے ایسے کارناموں کی حیثیت سے دیکھنا چاہیے جو دراصل آنے والے زیادہ معتبر، مستحکم اور مکمل کارناموں کے امکان کی خبر دیتے ہیں۔

'نظرے خوش گزرے' ان کے مضامین اور انشائیوں کا پہلا مجموعہ تھا۔ اس میں دو انشائیے 'شوہروں کی قسمیں' اور 'یہ مرد' اسلوب اور ظرافت کے اعتبار سے دورِ اوّل سے قریب ہیں مگر ان میں نظر زیادہ گہری اور تیکھی ہے۔ مواد کی تنظیم و ترتیب میں سلیقہ مندی زیادہ ہے۔ 'شوہروں کی قسمیں' میری رائے میں اُردو کے بہترین انشائیوں کے سخت سے سخت انتخاب میں جگہ پا سکتا ہے۔ مگر حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اُردو ظرافت پر لکھنے والوں نے اسے یکسر فراموش کر رکھا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ہم عرصے سے صرف پُرشور عظمتوں کی طرف متوجہ ہونے کے عادی ہو گئے ہیں اور معمولی کے غیر معمولی پن کو دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ یہ محرومی ہماری ادبی تنقید کی 'اخلاقی ناخواندگی' کا پتا دیتی ہے۔ ہماری ادبی زندگی میں اِدھر چند برسوں میں انشائیہ میں دل چسپی کا احیا ہوا ہے۔ اس احیا کے نتیجے میں اچھے بُرے سبھی طرح کے انشائیہ نگاروں کی پرکھ کا کام خواہ وہ معیاری ہو یا غیر معیاری' ہوا ہے۔ ہماری ادبی تنقید کی یہ مجرمانہ غفلت کسی طرح بھی معاف نہیں کی جا سکتی کہ اس نے بیگم انیس قدوائی کے انشائیوں کو، جن کے بغیر اردو انشائیے کا نسب نامہ مکمل نہیں کہا جا سکتا' نظر انداز کیا ہے۔ دیکھنا ہے کہ اتنا کچھ کہنے کے باوجود انیس ناشناسی کا دور کب ختم ہوتا ہے؟

'نظرے خوش گزرے' میں سارے مضامین انشائیہ کے زمرے میں نہیں آتے مگر ان میں جو بات مشترک ہے وہ ہے مزاح کی چاشنی، شگفتہ نکتہ رسی اور خوش طبعی۔ یہ اوصاف بیگم انیس قدوائی کی شخصیت کا حصّہ ہونے کی وجہ سے ان کے اسلوب کا سب سے اہم عنصر ہیں۔ یہی عناصر ان کے ادبی اسلوب کا شناس نامہ ہیں۔ وہ خود بھی مزاح کو زندگی کے المیاتی احساس پر قابو پانے کا ذریعہ سمجھتی تھیں۔

لکھنا اور وہ بھی مزاحیہ انداز سے لکھنا زندگی کی تلخ حقیقتوں سے ان کے لیے فرار کا ذریعہ تھا۔ "نظرے خوش گزرے"، کے پیش لفظ میں اپنے مضامین کے حوالے سے لکھتی ہیں :

"مجھے نہیں معلوم، اُردو ادب کو ان مضامین سے کتنا فائدہ ہوگا، کتنا نقصان ! میرا لکھنے کو دل چاہا، میں نے لکھا بغیر سود و زیاں کے اندازے کے۔ جب جی گھبرایا، کچھ لکھ ڈالا.... زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار کا یہی راستہ مجھے نظر آیا اور دلی سکون اسی سے حاصل ہوا۔ بہر حال خوش رہنے کا اس سے بہتر ذریعہ اور کون ہوسکتا تھا کہ کسی پر ہنسو، اپنے آپ پر ہنسو۔ اپنے پر اور دوسروں پر طنز و مزاح کے تیر چلاؤ اور پھر آہستہ آہستہ چوٹ کی کسک محسوس کرو۔"

طنز و مزاح کا یہ صحت مند تصور ان کی تحریروں کی جان ہے اور اپنی اور دوسروں کی زندگی کو گوارا بناتا ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کا مزاح سراسر خوش طبعی اور خوش باشی پر مبنی ہے۔ یہ بات صرف جُزوی طور پر دُرست ہے۔ ان کے مزاحیہ اور طنزیہ انداز نظر کے پیچھے اقدار کا رچا ہوا اور گہرا شعور ہے۔ وہ معاشرتی اور انفرادی زندگی کی ناہمواریوں پر ہنستی ہیں تو محض اس وجہ سے ہنستی ہیں کہ اکثر انقلابات صرف برہمی کی وجہ سے نہیں آئے ہیں بلکہ ہنسی بھی اس عمل کی محرّک ہوئی ہے۔ اسی وجہ سے میرا خیال ہے کہ ان کے طنز و مزاح کا مقصد و محور صرف اصلاحی نہیں بلکہ انقلابی اور ترقی پسندانہ ہے۔ ان کی یہی خوبی انھیں اپنے جیسے دوسرے طنز نگاروں اور مزاح نگاروں میں ممتاز کرتی ہے۔ طنز نگاری میں کمینگی، کینہ پروری اور انسان دشمنی (Misanthropy) کے در آنے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ اسی لیے اکثر طنز نگاروں کا طنز جلال سے زیادہ

جلن کی پیداوار محسوس ہوتا ہے۔ بیگم اَنیس قدوائی کا طنز انسانی شرف و سعادت کے ایک وسیع تصور سے وابستگی کی وجہ سے کشادہ دلی اور وسیع النظری کی فضا رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے اپنے زمانے میں انسانی شرف و سعادت کے اکثر تصوّرات ایک زبردست سوالیہ نشان کی زد پر ہیں اور ہماری نسل بامعنی طور پر ہنسنے کی صلاحیت سے محروم ہوتی جارہی ہے اور کبھی ہنستی بھی ہے تو اس میں تاریک طربیہ (Dark Comedy) کا رنگ ہوتا ہے۔

بیگم انیس قدوائی کے بعض مضامین ادبی موضوعات پر ہیں۔ ان مضامین میں جہاں انھوں نے ایک طرف رچے ہوئے ادبی ذوق کا ثبوت دیا ہے وہیں دوسری طرف اعلا درجے کی ادب شناسی کے بھی جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی ادب فہمی مدرّسانہ نہیں بلکہ خلّاقانہ ہے۔ وہ اپنے ذوق اور بصیرت پر بھروسا کرتی ہیں اور تاثراتی تنقید کے نمونے پیش کرتی ہیں۔ وہ کوئی پیشہ ور نقّاد نہیں تھیں مگر پیشہ ور نقّادوں کے یہاں جو خشکی اور خشونت ہوتی ہے اس سے ان کے مضامین پاک ہیں۔ وہ ادب پاروں کا براہ راست مطالعہ کرتی ہیں اور بقول خود "ہر شاعر اور ادیب کو اس کے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔" مطالعۂ ادب کا یہ طریقہ بہرحال ایک معتبر طریقہ ہے۔ اس میں فن پارے پر کامل توجہ ہوتی ہے اور اس توجہ کے نتیجے میں جو تاثرات مرتّب ہوتے ہیں ان میں خبر سے زیادہ نظر ہوتی ہے۔ بیگم انیس قدوائی معاشرتی تنقید کے پھیر میں نہیں پڑتیں۔ وہ ایک رچے ہوئے ادبی ذوق کے ساتھ ادب کو پڑھنے، لطف اندوز ہونے اور اس لطف میں قاری کو شریک کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ آج جب کہ یونیورسٹیوں میں پروان چڑھنے والی Academic قسم کی تنقید کو اس کی خشک ضابطہ بندی اور علم نمائی کی وجہ سے مسترد کیا جارہا ہے، امید بندھتی ہے کہ بیگم انیس قدوائی کی طرح کی تنقید کا اعتبار بڑھے گا۔ اگرچہ بیگم انیس قدوائی نے غالب، مومن، نظیر سبھی کے بارے میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے پھر بھی میرا خیال ہے کہ

اردو فکشن کے سلسلے کے ان کے مضامین نسبتاً زیادہ کامیاب ہیں۔ خاص طور پر مرزا ہادی رسوا، رتن ناتھ سرشار اور منشی پریم چند پر ان کے مضامین اپنے لطف وبصیرت کی وجہ سے تادیر یاد رہیں گے۔ ان کی شگفتہ اور تخلیقی طور پر شاداب تنقید کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

ریختی جو دراصل زوال آشنا معاشرے میں مردوں کی نسوانیت کا اظہار تھی، بیگم انیس قدوائی کی تنقید کا ہدف بنتی ہے:

"ایسا لگتا ہے جیسے طوائف الملوکی کا اتنا گہرا اثر سوسائٹی پر پڑا تھا کہ پوری سوسائٹی طوائف بن کر رہ گئی تھی اور اگر ریختی اس زمانے کی سوسائٹی اور ماحول کی آئینہ دار ہے تو ہمیں یقیناً بے تکلف چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنا چاہیے"۔

نظیر اکبرآبادی کے بارے میں لکھتی ہیں:

"نظیر جیسا خوش قسمت شاعر اور بے نظیر کھلاڑی شاید ہی دوسرا گزرا ہو۔ ادب کی بہت بڑی فیلڈ میں وہ کبڈی کھیلتے رہے اور دنیا کی بساط پر وہ ۹۶ سال تک الفاظ کی شطرنج کھیلے"۔

وہ مرزا غالب کی فارسی شاعری کی مدّاح ہیں مگر غالب کی شاعری پر ہماری تنقید نے جو ٹھوکریں کھائی ہیں اس کا بھی انھیں شدید احساس ہے:

"بہرحال غالب نے فارسی شاعری میں بھی خوب خوب جولانیِ طبع دکھائی ہے۔ فارسی دیوان کی یہ بدنصیبی رہی کہ اسے کوئی عبدالرحمٰن بجنوری نہیں ملا اور اتنی خوش قسمتی بھی کہ اسے ڈاکٹر عبداللطیف سے سابقہ نہیں پڑا"۔

لکھنے کو تو مرزا ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا تھا مگر

ان کا کوئی بھی ناول کامیاب نہیں ہے:

"خدا بھلا کرے بی امراؤ جان ادا کا کہ انھوں نے اس پیمانے میں چھلک کر زندانِ مے خانہ کو لب سوز و لب بند کر دیا ورنہ سچ پوچھیے تو بحیثیت ناول نویس کے مرزا کے پاس مسجد کی بدھنی، نرکل کا قلم یا انگریزی ہولڈر کے سوا دھرا ہی کیا تھا"۔

سرشار کی مبالغہ آمیز وطن پرستی پر ایک بلیغ تبصرہ ملاحظہ ہو:

"سرشار کی وطن پرستی بھی اپنی مثال نہیں رکھتی۔ بمبئی ہے تو لکھنؤ، قسطنطنیہ ہے تو لکھنؤ، میدانِ جنگ ہے تو اس پر بھی لکھنؤ کا رنگ چھایا ہوا ہے اور دریائے ڈینوب کے اُس پار بھی لکھنؤ آباد ہے"۔

بیگم انیس قدوائی اقبال کی بڑی مدّاح تھیں مگر عورت کی طرف ان کے رویّے سے خاصی شاکی ہیں:

"انھوں نے لفظی مباحثے بھی کیے ہیں، شکایتیں اور مناجاتیں بھی کی ہیں، سیاسی فارمولے بھی پیش کیے ہیں، بین الاقوامی مسائل پر بھی بحث کی ہے مگر ہر جگہ مرد ہی سے مخاطب رہے ہیں۔ غضب ہے کسی کی گود میں بلّی دیکھ کر وہ بلّی کی مالکہ سے نہیں خود بلّی سے مخاطب ہو جاتے ہیں جیسے عورت اور بلّی میں کوئی فرق نہیں"۔

میں نے ان کی تنقید نگاری کی طرف یوں خصوصی توجہ کی ہے کہ ان کی دوسری حیثیتوں کی طرح یہ حیثیت بھی عام نظروں سے چھپی ہوئی ہے اور ابھی تک اس کا خاطر خواہ اعتراف نہیں کیا گیا ہے۔

بیگم انیس قدوائی نے خاکہ نگاری میں بھی اپنے کمالِ فن کا اظہار کیا ہے اور یہاں بھی ان کی انسان دوستی اور اقدار سے وابستگی نے ایک

جلوۂ صد رنگ مرتب کر دیا ہے۔ "اب جن کے دیکھنے کو۔۔۔" ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے جسے مکتبہ جامعہ نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا تھا۔ اس فن میں مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، محمد طفیل اور شوکت تھانوی نے جو کمال حاصل کیا ہے اس سے انکار نہیں پھر بھی انیس قدوائی کے خاکے یا مرقعے اس فن کے سارے تقاضے پورے کرتے ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان کی ادبی حیثیت اور اہمیت کا اعتراف کیا جائے۔ اس فن میں کامیابی کے لیے ایک ایسی نظر کی ضرورت ہوتی ہے جو انسانی شخصیت کی پیچیدگیوں، بوالعجبیوں، تضادوں اور ردّعمل کے متنوع جلوؤں کو دیکھ اور سمجھ سکے۔ زندگی کی گہری سوجھ بوجھ کے بغیر اس فن میں کامیابی ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ شخصیات کی Idiosyncracies سے بیزار ہونے کے بجائے ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ زندگی کی طرف جب تک خاکہ نگار کا رویہ اثباتی نہ ہو کامیابی مشکوک رہتی ہے۔ بیگم انیس قدوائی نے اپنے قلمی خاکوں میں جن شخصیات کو موضوع بنایا ہے ان میں سب ایک جیسی نہیں ہیں۔ ان میں بیشتر تو بیسویں صدی کے ہندستان کی تاریخ ساز شخصیتیں ہیں۔ ان کے بقول خود وہ یوں متاثر ہوئی ہیں کہ ان میں علمی قابلیت تھی، اخلاقی کردار تھا، تدبّر تھا، دنیا سے محبت بھرا لگاؤ تھا اور ایک طرح کی خوش عقیدگی تھی۔ مگر ان شخصیتوں میں بعض ایسی بھی ہیں جو سماجی اور سیاسی حیثیت سے بہت بلند تو نہیں ہیں مگر ان میں کچھ ایسے اوصاف ہیں جو انھیں جاذبِ توجہ بناتے ہیں۔ ان خاکوں میں جواہر لعل نہرو، رفیع احمد قدوائی، مولانا محمد علی، سیف الدین کچلو کے ساتھ مرزا ابوالفضل اور ان کے خاندانی ملازم حافظ جمّن کے بھی خاکے ہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بیگم انیس قدوائی ان شخصیتوں کے سماجی درجات سے بے نیاز ہو کر لکھتی ہیں۔ تخلیقی توجہ کی یہ مساوات پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ وہ جس پر بھی لکھتی ہیں ارادت مندی سے آزاد ہو کر لکھتی ہیں۔ وہ عظمتوں کی بھی متلاشی رہتی ہیں اور

کمزوریوں کو دیکھ کر حیرت میں مبتلا نہیں ہوتیں اُن سے لطف لیتی ہیں۔ وہ تضادات سے گھبراتی نہیں بلکہ انھیں شخصیت کی مایہ داری کا جزو سمجھتی ہیں۔ "اب جن کے دیکھنے کو۔۔" دراصل ایک نگار خانہ ہے۔ شوخ اور ہلکے رنگوں کی پیچیدگیوں سے آباد، مسرتوں اور بصیرتوں سے معمور، طنز و مزاح کی روشنیوں سے تابندہ و تابناک!

بیگم انیس قدوائی کا ایک لازوال کارنامہ اور ہے، وہ ہے ان کی تصنیف "آزادی کی چھاؤں میں"۔ یہ کتاب ۱۹۴۷ء کے ہولناک فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر ہے اور بہت سے مہیب اور سفّاک حقائق کو سامنے لاتی ہے — ایسے حقائق جن کی تاب لانے کی صلاحیت شاید آج بھی ہم میں پیدا نہیں ہو سکی ہے۔

بیگم انیس قدوائی کی یہ کتاب ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ انھوں نے جو کچھ اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے نہایت غیر جانبداری اور معروضیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اجتماعی دیوانگی کے اس خونریز دور میں جب بڑے بڑوں کے ایقانات کمزور پڑ گئے تھے اور انسانی شرف و سعادت کے سارے تصورات بے معنی معلوم ہو رہے تھے، انیس قدوائی کا استقلال جن کے شوہر شفیع احمد قدوائی مسوری میں شہید کر دیے گئے تھے، حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ انھوں نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے:

> "ان دنوں حالات نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی تھی کہ غیر جانب داری، انصاف اور انسانیت کا دامن پکڑے رہنا بعض وقت مشکل ہو جاتا تھا لیکن اسلام کے اس صحیح اوّلین تصوّر کا نقش اور گاندھی جی کے فیضِ صحبت کے اثر سے اتنا ہوش باقی تھا اور مجھے یقین رہا کہ آدمیت عینِ اسلام ہے اور اسلام عینِ انسانیت۔"

اپنے ذاتی سانحے سے بے نیاز ہو کر، گاندھی جی کی ہدایت پر، وہ دہلی آئیں

جلوۂ صد رنگ مرتب کر دیا ہے۔ "اب جن کے دیکھنے کو...." ان کے خاکوں کا مجموعہ ہے جسے مکتبہ جامعہ نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیا تھا۔ اس فن میں مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، محمد طفیل اور شوکت تھانوی نے جو کمال حاصل کیا ہے اس سے انکار نہیں پھر بھی انیس قدوائی کے خاکے یا مرقعے اس فن کے سارے تقاضے پورے کرتے ہیں اور اس قابل ہیں کہ ان کی ادبی حیثیت اور اہمیت کا اعتراف کیا جائے۔ اس فن میں کامیابی کے لیے ایک ایسی نظر کی ضرورت ہوتی ہے جو انسانی شخصیت کی پیچیدگیوں، بوالعجبیوں، تضادوں اور ردِ عمل کے متنوع جلوؤں کو دیکھ اور سمجھ سکے۔ زندگی کی گہری سوجھ بوجھ کے بغیر اس فن میں کامیابی ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ شخصیات کی Idiosyncracies سے بیزار ہونے کے بجائے ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ زندگی کی طرف جب تک خاکہ نگار کا رویہ اثباتی نہ ہو کامیابی مشکوک رہتی ہے۔ بیگم انیس قدوائی نے اپنے قلمی خاکوں میں جن شخصیات کو موضوع بنایا ہے ان میں سب ایک جیسی نہیں ہیں۔ ان میں بیشتر تو بیسویں صدی کے ہندستان کی تاریخ ساز شخصیتیں ہیں۔ ان کے بقول خود وہ یوں متاثر ہوئی ہیں کہ ان میں علمی قابلیت تھی، اخلاقی کردار تھا، تدبّر تھا، دنیا سے محبت بھرا لگاؤ تھا اور ایک طرح کی خوش عقیدگی تھی۔ مگر ان شخصیتوں میں بعض ایسی بھی ہیں جو سماجی اور سیاسی حیثیت سے بہت بلند تو نہیں ہیں مگر ان میں کچھ ایسے اوصاف ہیں جو انھیں جاذبِ توجہ بناتے ہیں۔ ان خاکوں میں جواہر لعل نہرو، رفیع احمد قدوائی، مولانا محمد علی، سیف الدین کچلو کے ساتھ مرزا ابوالفضل اور اُن کے خاندانی ملازم حافظ جمّن کے بھی خاکے ہیں۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ بیگم انیس قدوائی ان شخصیتوں کے سماجی درجات سے بے نیاز ہو کر لکھتی ہیں۔ تخلیقی توجہ کی یہ مساوات پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ وہ جس پر بھی لکھتی ہیں ارادت مندی سے آزاد ہو کر لکھتی ہیں۔ وہ عظمتوں کی بھی متلاشی رہتی ہیں اور

کمزوریوں کو دیکھ کر حیرت میں مبتلا نہیں ہوتیں اُن سے لطف لیتی ہیں۔ وہ تضادات سے گھبراتی نہیں بلکہ انھیں شخصیت کی مایہ داری کا جزو سمجھتی ہیں۔ "اب جن کے دیکھنے کو..." دراصل ایک نگارخانہ ہے ــ شوخ اور ہلکے رنگوں کی پیچیدگیوں سے آباد، مسرتوں اور بصیرتوں سے معمور، طنز و مزاح کی روشنیوں سے تابندہ و تابناک!

بیگم انیس قدوائی کا ایک لازوال کارنامہ اور ہے، وہ ہے ان کی تصنیف "آزادی کی چھاؤں میں"۔ یہ کتاب ۱۹۴۷ء کے ہولناک فرقہ وارانہ فسادات کے موضوع پر ہے اور بہت سے مہیب اور سفاک حقائق کو سامنے لاتی ہے ــــ ایسے حقائق جن کی تاب لانے کی صلاحیت شاید آج بھی ہم میں پیدا نہیں ہو سکی ہے۔

بیگم انیس قدوائی کی یہ کتاب ان کے ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ انھوں نے جو کچھ اپنی جاگتی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے نہایت غیر جانبداری اور معروضیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اجتماعی دیوانگی کے اس خونریز دور میں جب بڑے بڑوں کے ایقانات کمزور پڑ گئے تھے اور انسانی شرف و سعادت کے سارے تصورات بے معنی معلوم ہو رہے تھے، انیس قدوائی کا استقلال جن کے شوہر شفیع احمد قدوائی مسوری میں شہید کر دیے گئے تھے، حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ انھوں نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے:

> "ان دنوں حالات نے ایسی نازک صورت اختیار کر لی تھی کہ غیر جانب داری، انصاف اور انسانیت کا دامن پکڑے رہنا بعض وقت مشکل ہو جاتا تھا لیکن اسلام کے اس صحیح اوّلین تصور کا نقش اور گاندھی جی کے فیضِ صحبت کے اثر سے اتنا ہوش باقی تھا اور مجھے یقین رہا کہ آدمیت عینِ اسلام ہے اور اسلام عینِ انسانیت۔"

اپنے ذاتی سانحے سے بے نیاز ہو کر، گاندھی جی کی ہدایت پر، وہ دہلی آئیں

اور آگ اور خون کے اس تماشے میں مظلوموں کی خدمت میں لگ گئیں۔ انھوں نے جس بے خوفی، ہمّت، استقلال اور عزم کے ساتھ فسادزدوں کی بحالی کا کام مہاجر کیمپوں میں کیا، اس کی سرگذشت اس کتاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب دراصل ایک رپورتاژ ہے۔ اُن خوں آشام اور ہولناک واقعات کا جو دلّی اور اس کے قرب وجوار میں پیش آئے۔ اس کتاب میں کیسی کیسی حزیں اور حسرت ناک تصویریں اُبھرتی ہیں۔ ایک لاوارث بچہ اسپتال میں کہتا ہے:

"دیکھو یہ رشید ہے اس کے تو سب مرگئے اور وہ زینب ہے اس کے بھی سب مرگئے اور بابو کی امّاں کا گلا کاٹ دیا گیا"

اب بیگم انیس قدوائی کا تاثر دیکھیے:

"بچوں نے اتنی خونریزی دیکھی تھی کہ چار سال کی عمر میں خون خون پکارتے تھے اور موت کا مذاق اڑاتے تھے اور اس کے آنے کی دعائیں مانگتے تھے۔ آخر یہ خونی دماغ، یہ پتھر دل، محبت سے ناآشنا بچے کہاں جائیں گے۔ یہ نسل تو ڈوبی ہی ہے۔ حال تو بدتر ہے، مستقبل بھی تباہ ہو رہا ہے۔ آیندہ نسل اس سے بھی کئی گنا بڑھ چڑھ کر اندھی ہوگی"

اس سے بھی بڑھ کر ایک اور الم ناک تصویر دیکھیے۔ اس میں جو کچھ ماورائے سخن ہے اس کا اندازہ کیجیے:

"ہم سب آگے بڑھے تو خالی مکانوں سے پانو کی چاپ سُن کر کتوں نے منہ نکال کر جھانکا۔ شاید وہ اب تک اپنے مالکوں کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے"

اس کتاب کو پڑھ کر قرۃ العین حیدر نے ایک بلیغ جملہ کہا تھا جو اس وقت کے منظرنامے کے سارے المیّے کا اظہار ہے۔ انھوں نے کہا تھا "۳۷۵ صفحات کی اس کتاب کو

پڑھنے کے بعد خیال آتا ہے کہ دانتے کا جہنم ایک پکنک رہی ہوگی"

یہ کتاب ۱۹۴۹ء میں لکھی گئی تھی مگر اس کی اشاعت ۱۹۷۴ء میں ہوئی۔ اس کتاب کے مسودے کو دیکھ کر ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم نے کہا تھا کہ ابھی ہندستان میں اتنی تاب نہیں پیدا ہوئی ہے جو اس کتاب کی سچّائی کو سہار سکے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب ناشروں کے یہاں چکّر لگاتی رہی اور کسی نہ کسی بہانے اس کی طباعت ٹلتی رہی۔ تقسیم کے بعد پیش آنے والے حادثات کی یہ ایک ایسی مستند دستاویز ہے جسے آنے والے مورّخ نظر انداز بھی کرنا چاہیں گے تو نہ کرسکیں گے۔ میرے لیے اس کتاب کی یوں بھی اہمیت ہے کہ یہ صحافت سے بلندتر ایک ممتاز ادبی کارنامہ بھی ہے۔

بیگم انیس قدوائی کی چوتھی اور آخری کتاب 'غبارِ کارواں' شائع ہو رہی ہے یہ دراصل ان کی ناتمام خودنوشت سوانح ہے۔ انھوں نے اپنی عمر کی ۷۲ ویں منزل پر پہنچ کر اسے قلم بند کرنا شروع کیا تھا اور وہ ابھی اپنی حکایتِ حیات کو ۱۹۲۶ء تک ہی لاپائی تھیں کہ ان کی صحت بگڑنے لگی اور انھوں نے اسے مکمّل کرنے کا ارادہ ترک کردیا اور پھر یوں ہوا کہ ۱۶ر جولائی ۱۹۸۲ء کو ان کا بلاوا آگیا اور

ٹھنڈی تھی جس کی چھانو وہ دیوار گر گئی

'غبارِ کارواں' کا مسوّدہ ان کی بیٹی کشور کے پاس تھا۔ انھوں نے ازراہِ کرم مجھے اس کے ساتھ اور بھی مسوّدے دیے اور کہا کہ دیکھیے ان میں اگر کچھ غیرمطبوعہ ہو تو چھپوانے کی فکر کیجیے۔ ان میں بہت کچھ مواد ایسا تھا جو چھپ چکا تھا اور کسی نہ کسی شکل میں ان کی کتابوں میں شامل تھا۔ صرف 'غبارِ کارواں' ہی غیرمطبوعہ تھا۔ اسے پڑھتے ہوئے خیال آیا کہ یہ نامکمّل ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر تکمیل کی بہت سی خوبیاں رکھتا ہے اور اسے نہ شائع کرنے میں ہماری تاریخ اور ادب کا زیاں ہے۔ 'غبارِ کارواں' صرف انیس آپا کی زندگی کی کہانی نہیں ہے، اس میں ہماری معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کے بہت سے ایسے نقوش ہیں جنھیں ان کے قلم نے بڑی خوبی اور

خوبصورتی سے ابھارا اور محفوظ کیا ہے۔ اسے آپ Family Saga کے طور پر بھی پڑھ سکتے ہیں اور تہذیبی اور سیاسی تاریخ کی حیثیت سے بھی۔ اس میں آپ ایک جاتی ہوئی دنیا کا حُسن بھی دیکھ سکتے ہیں اور ایک آتی ہوئی تہذیب کے قدموں کی چاپ بھی سُن سکتے ہیں۔ بیگم انیس قدوائی کے حوالے سے بات کروں تو یہ کہوں گا کہ یہ ایک ادھورا رزمیہ ہے مسلم متوسط گھرانے کی ایک عورت کا جو اپنی شناخت کے سفر پر نکلتی ہے اور طرح طرح کی مشکلات و موانع کے باوجود کامیاب و کامراں ہوتی ہے۔

'غبارِ کارواں' میں اس صدی کی ابتدائی دو دہائیاں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ان دہائیوں کے ایسے جاوداں نقوش کم ازکم اُردو میں مجھے کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملے۔ مجھے توقع ہے کہ اس کی دستاویزی حیثیت کے اعتراف میں میں تنہا نہیں رہوں گا۔

'غبارِ کارواں' کے ساتھ بیگم انیس قدوائی کے ابتدائی دَور کے مضامین کی فراہمی کے لیے میں جناب عابد رضا بیدار ڈائرکٹر، خدا بخش لائبریری، پٹنہ کا ممنون ہوں۔ بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اس سلسلے میں محترمی انور جمال قدوائی اور شاہد علی خاں صاحب کی رہنمائی اور مسلسل تحریکِ عمل کا اعتراف نہ کروں۔

انور صدّیقی
شعبۂ ادبیات انگریزی
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

۲۷ دسمبر ۸۳ء

URD
891.4393016
Q15
Gh

غبارِ کارواں

(ناتمام خودنوشت)

891.4393016 URD
Q15 Gh
138751

138751